اسرارخودی پراعتراضات کی حقیقت

مولانا اسلم جیراجپوری

ڈاکٹر اقبال کی مثنوی اسرار خودی جب سے شائع ہوئی ہے اس وقت سے مخالفین کے اعتراضات کا سلسلہ جاری ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر موصوف نے اس مثنوی میں تصوف کی بحث میں حکیم افلاطون یونانی اور خواجہ حافظ شیرازی کو بزوگوسفند لکھا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

راہب اول فلاطون حکیم — از گروہ گوسفندان قدیم
گوسفندے در لباس آدم است — حکم او بر جان صوفی محکم است
بسکہ از ذوق عمل محروم بود — جان او وارفتۂ معدوم بود
منکر ہنگامۂ موجود گشت — خالقِ اعیان نامشہود گشت
کار او تحلیل اجزائے حیات — قطع شاخ سرو رعنائے حیات

خواجہ حافظ کے متعلق لکھا ہے:

ہوشیار از حافظ صہبا گسار — جامش از زہر اجل سرمایہ دار
نیست غیر از بادہ در بازار او — از دو جام آشفتہ شد دستار او
چوں جرس صد نالۂ رسوا کشید — عیش ہم و منزل جاناں ندید
آں فقیہ ملت میخوارگاں — آں امام ملت بیچارگاں
گوسفنداست ونوا آموخت است — فتنہ و ناز و ادا آموخت است
دلربائی ہائے او زہراست و بس — چشم او غارت گر شہراست و بس
از بزیوناں زمین زیرک تراست — پردہ عودش حجاب اکبر است
بگزراز جامش کہ در مینائے خویش — چوں مریدان حسن دارد حشیش
محفل او در خور ابرار نیست — ساغر او قابل احرار نیست

بے نیاز از محفل حافظ گذر   الحذر از گوسفنداں الحذر

مخالفین کو افلاطون کی نسبت کم لیکن خواجہ حافظ کی بابت زیادہ ملال ہے کیونکہ وہ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک مقدس بزرگ بھی تسلیم کیے جاتے ہیں اسی وجہ سے حمیت کے جوش میں وہ بھی ڈاکٹر صاحب کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہیں۔

میں ایک عرصہ سے اس بحث کو دیکھ رہا تھا، لیکن اس وجہ سے خاموش تھا کہ یہ اصولی بحث نہ تھی۔ چند روز ہوئے میرے پاس مثنوی رموز بیخودی ایک دوست کے ذریعہ سے پہنچی جو خان بہادر پیرزادہ مظفر احمد صاحب متخلص بہ فضلی پنشنر ڈپٹی کلکٹر محکمہ انہار پنجاب نے اسرار خودی کے جواب میں لکھ کر شائع کی ہے۔ بعض دوستوں نے اصرار کیا کہ میں کچھ ضرور ان مثنویوں پر لکھوں۔ اس لیے مجبوراً مہر سکوت کو توڑنا پڑا۔ لیکن میرے اس لکھنے کا منشا صرف یہ ہے کہ اس بحث کو اصل مرکز پر لاؤں تاکہ آیندہ موافقین یا مخالفین جو کچھ لکھیں وہ قوم کے لیے مفید ہو ذاتیات سے کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔

احترام سلف

ڈاکٹر صاحب نے اس مثنوی میں خواجہ صاحب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اگر نہ لکھتے تو بہتر تھا کیونکہ اس کی وجہ سے ایک تو خود ان کی ذات پر حملے ہونے لگے اس لیے کہ قدیمی اصول ہے:

بزرگش نخوانند اہل خرد   کہ نام بزرگاں بزشتی برد

دوسرے نفس مسئلہ جو مفید تھا ان ناگوار بحثوں کے حجاب میں آ گیا۔ چنانچہ پیرزادہ صاحب جنھوں نے اس دھوم دھام سے اس مثنوی کا جواب لکھا ہے وہ بھی اصلی بحث کو نظر انداز کر گئے اور صرف افلاطون اور حافظ کی مدح سرائی اور ڈاکٹر صاحب پر مثلیں چست کرنے میں مشغول رہے۔ بز و گوسفند کے جواب میں کہیں شغال اور کہیں خر بنایا ہے اور دشمنِ اسلام اور رہزنِ اسلام وغیرہ خطابات بخشے ہیں لکھتے ہیں:

خود ز ما خیلے بسے وحشت سگال   جامہ زن در نیل دستاں چوں شغال
فلسفی فطرت زدیں برگشتگاں   در بیابان جنوں سر گشتگاں
عقل و دین و داد را دشمن ہمہ   در لباس سخنگاں رہزن ہمہ
از دم گفتار دستاں داستاں   فلسفہ در دل تصوف بر زباں
دشمنِ جاں آمدند اسلام را   رہزن جاں آمدند اسلام را
وائے بر ایں پختگان عقل خام   اولیا را میش و بز کردند نام
از دم مکر شغالاں الحذر   الحذر از بد سگالاں الحذر

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

از خودی پیغارہ زن اسلاف را　　کردہ پامالِ جنوں انصاف را
بندۂ دنیا بہ دنیا دیں فروش　　سر بسر ملت فروش، آئیں فروش

پیرزادہ صاحب کے ان اقوال کو جب صوفیانہ حلم اور حسن ظن کی میزان میں ہم تولتے ہیں تو ان کی سبکی نہایت حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔

خواجہ حافظ کے کلام کے متعلق اس قسم کی رائیں پہلے سے بھی لوگوں کی چلی آتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کچھ اس کے اول مجرم نہیں ہیں۔ چنانچہ مشہور ہے کہ بادشاہ عالمگیر نے عام منادی کرادی تھی کہ دیوان حافظ کوئی نہ پڑھے کیونکہ لوگ اس کے ظاہری معنی سمجھ کر گمراہ ہوتے ہیں۔ نیز مولانا حالی مرحوم نے حیات سعدی میں لکھا ہے:

خواجہ حافظ کی غزل مجالس اور محافل میں سب سے زیادہ گائی جاتی ہے اور اس کے مضامین سے اکثر لوگ واقف ہیں وہ ہمیشہ سامعین کو چند باتوں کی ترغیب دیتی ہے۔ عشق حقیقی کے ساتھ عشق مجازی اور صورت پرستی و کام جوئی کو بھی وہ دین و دنیا کی نعمتوں سے افضل بتاتی ہے۔ مال و دولت و علم و ہنر، نماز و روزہ، حج و زکوۃ، زہد و تقویٰ غرض کہ کسی شے کو نظر بازی اور شاہد پرستی کے برابر نہیں ٹھہراتی وہ عقل و تدبیر، مال اندیشی، تمکین و وقار، ننگ و ناموس، جاہ و منصب وغیرہ کی ہمیشہ مذمت کرتی ہے اور آزادی، رسوائی، بدنامی وغیرہ کو جو عشق کی بدولت حاصل ہو تمام حالتوں سے بہتر ظاہر کرتی ہے۔ دولت دنیا پر لات مارنا، عقل و تدبیر سے کام نہ لینا۔ توکل و قناعت کے نشہ میں اپنی ہستی مٹا دینا اور جوہر انسانیت کو خاک میں ملا دینا، دنیا و مافیہا کے زوال و فنا کا ہر وقت تصور باندھے رکھنا، علم و حکومت کو لغو و پوچ اور حجاب اکبر جاننا، حقائق اشیاء میں کبھی غور و فکر نہ کرنا کفایت شعاری اور انتظام کا ہمیشہ دشمن رہنا جو کچھ ہاتھ لگے اُس کو فوراً کھو دینا اور اسی طرح کی بہت سی باتیں اس سے مستفاد ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام مضامین ایسے ہیں جو ہمیشہ بے فکروں اور نوجوانوں کو بالطبع مرغوب ہوتے ہیں اور کلام کا سادہ اور عام فہم ہونا اور شاعر کی فصاحت و بلاغت اور مطرب و رقاصہ کی خوش آوازی اور حسن و جمال اور مزامیر کے لئے اُن کو لے اڑتی ہے اور اُن کی تاثیر کو دس بیس گنا کر دیتی ہے اور جب باوجود ان سب باتوں کے سامعین کو یہ اعتقاد بھی ہو کہ اس کلام کے قائل اکابر صوفیہ اور مشائخ کرام ہیں، جن کی تمام عمر حقائق اور معارف کو بیان کرنے میں گذری ہے اور جن کا شعر شریعت کا رہنما اور عالم لاہوت کی آواز ہے تو یہ مضامین اور بھی زیادہ دلنشین ہو جاتے ہیں۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

خواجہ حافظ کی غزل کی ممارست اور مزاولت سے بیشک ابرار و احرار کے دلوں میں دنیا کی بے ثباتی اور توکل و استغنا و قناعت کا پختہ خیال پیدا ہوتا ہے اور اوباش و الواط کو ناعاقبت اندیشی، عشق بازی، بدنامی و رسوائی کی

ترغیب ہوتی ہے اور قوم کی موجودہ حالت کے لحاظ سے پہلی تاثیر بھی ویسی ہی خانہ برانداز اور خانماں سوز ہے جیسی دوسری۔

ہم نے خود اپنی تصنیف حیات حافظ میں ان رایوں کو نقل کیا ہے اور ان کا جواب بھی دیا ہے، لیکن ہمارے جواب کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ ''حسن کا معیار یہی ہے کہ وہ کمال درجہ کا دلکش ہو۔عشاق کی رسوائی سے حسن برا نہیں قرار پا سکتا''۔ باقی حافظ کی غزل کے ان اثرات سے جو مولانا حالی نے لکھے ہیں کون انکار کر سکتا ہے! بے شک یہاں تک ہم پیرزادہ صاحب کے ساتھ ہیں کہ:

الادب پیغارہ برمستاں مزن　　　شیشۂ خود بر سر سنداں مزن
در گذر از بادہ خوار اے محتسب　　　مست را معذور دار اے محتسب

لسان الغیب

مولانا حکیم فیروزالدین احمد صاحب طغرائی نے ڈاکٹر صاحب کے جواب میں جو رسالہ لسان الغیب کے نام سے شائع کیا ہے اُس میں جو پہلو جواب کا اختیار کیا ہے وہ ''سوال از آسمان و جواب از ریسمان'' کا مصداق ہے۔ شعراء اور تذکرہ نگاروں نے کلام حافظ کی جو مدح کی ہے وہ شاعری اور صوفیانہ رموز کے لحاظ سے ہے، اور ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کلام کی اِن خوبیوں کو ڈاکٹر صاحب بہ نسبت حکیم صاحب موصوف کے زیادہ سمجھتے ہیں۔ بحث جو کچھ ہے وہ ان کے اثرات کے متعلق ہے جو خواجہ کے کلام سے جذبات پر پڑتے ہیں۔ اس لیے ان محامد و مدائح کا نقل کر دینا جو ڈاکٹر صاحب کے بھی پیش نظر ہیں جواب کے لیے کافی نہیں ہو سکتا۔

علاوہ بریں حکیم صاحب موصوف نے شعر العجم سے بہت کچھ استدلال فرمایا ہے کہ علامہ شبلی نے کلامِ حافظ کو چناں و چنیں لکھا ہے۔ مگر اُن کو یہ خبر نہیں کہ اس شعر العجم میں عمر خیام کے تذکرہ میں ہے کہ:

افسوس ہے کہ خیام خواجہ حافظ کی طرح صوفی نہ تھا ورنہ اس کی شراب بھی شراب معرفت بن جاتی۔

اسرار خودی میں خواجہ حافظ کے جن اشعار کی طرف تلمیح ہے اُن کے جو لطیف معانی حکیم صاحب نے بیان کیے ہیں اور جو جو صوفیانہ نکات اُن سے نکالے ہیں وہ ہر شاعر کے ہر شعر سے نکالے جا سکتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کچھ عرصہ ہوا میں نے کسی مضمون نگار کا مضمون پڑھا تھا جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ''خواجہ آتش لکھنوی کا کلام تصوف اور معرفت سے لبریز ہے'' اور اس کے شواہد بھی لکھے تھے۔ نیز بمبئی کے کسی اخبار میں ایک گبر کا یہ دعویٰ بھی دیکھنے میں آیا تھا کہ خواجہ حافظ آتش پرست تھے۔ مدعی نے خود حافظ کی غزل سے اس

پر استدلال کیا تھا۔ منجملہ اُن کے ایک غزل جو مجھے یاد رہ گئی یہ ہے:

کنونکہ در چمن آمد گل از عدم بہ وجود — بنفشہ در قدم او نہاد سر بسجود

اس غزل کے مندرجہ ذیل شعر کو اس نے اپنے عجیب وغریب دعویٰ کے ثبوت میں پیش کیا تھا:

بباغ تازہ کن آئین دین زردشتی — کنونکہ لالہ برافروخت آتش نمرود

حافظ وعرفی

ہم کو سب سے زیادہ جو بات مثنوی اسرار خودی میں حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے:

حافظِ جادو بیان شیرازی است — عرفی آتش زبان شیرازی است

ایں سوئے ملک خودی مرکب جہاند — واں کنارِ آب رکنا باد ماند

ایں قتیل ہمت مردانۂ — آں ز رمز زندگی بیگانۂ

بادہ زن با عرفی ہنگامہ خیز — زندہ ای از صحبت حافظ گریز

اس لیے کہ اگر شاعری کے دائرہ میں رہنا ہے تو حافظ کو چھوڑ کر عرفی کو مقتدا بنا لینا بعینہ اس مثل کا مصداق ہے ''فر من المطر و وقع تحت المیزاب''۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری شاعری خرِ دجال ہے خرعیسیٰ نہیں ہے اس کے چند مخصوص عنوانات ہیں جن کو واقعیت سے کوئی سروکار نہیں ہے، انھیں کو شعراء الفاظ کے نئے نئے لباس میں پیش کرتے ہیں۔ یہ نہ زندگی کے لیے کسی عملی شاہراہ کی طرف ہدایت کرتی ہے نہ سوائے ادبی لطافت کے کوئی خاص مقصد پیش نظر رکھتی ہے۔ قرآن شریف نے جس شاعری کو مذموم قرار دیا ہے اُس کا بہترین یا بدترین نمونہ یہی ہے۔ الا ما شاء اللہ مولانا حالی نے بہت صحیح فرمایا ہے:

وہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر — عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر

ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر — زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر

ہوا علم دیں جس سے برباد سارا — وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا

عقیدت مندی نے خواجہ حافظ کے کلام پر بھی تقدس کا ایک غلاف چڑھا دیا ہے، عرفی کا کلام تو اس سے بھی عاری ہے۔ رہیں ادبی خوبیاں تو ان کے لحاظ سے خود عرفی اسی شمع کا پروانہ ہے۔ کہتا ہے:

بگرد مرقد حافظ کہ کعبۂ سخن است — در آمدیم بعزم طواف در پرواز

بیشک نخوت اور خودستائی کہیں کہیں اس کے کلام میں پائی جاتی ہے لیکن وہ خود ڈاکٹر صاحب کی مصطلحہ خودی کے متضاد ہے۔

بحث خودی

پیرزادہ صاحب نے خودی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے خواجہ حافظ کے جوشِ حمایت میں ڈاکٹر صاحب کے مفہوم مقصود کو سہواً یا قصداً نظر انداز کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تو صاف لکھ دیا ہے کہ ''خودی کو بمعنی غرور میں نے استعمال نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس کا مقصود محض احساسِ نفس یا تعینِ ذات ہے''۔ باوجود اس تصریح کے اس لفظ کے جو معنی انھوں نے خود ڈاکٹر صاحب کے اشعار سے نکالنے کی کوشش کی ہے اس میں صریحی طور پر انصاف سے تجاوز کر گئے ہیں، اس لیے کہ جب کوئی لفظ کسی اصطلاحی معنی میں رکھ لیا گیا تو اس کے لغوی معنی لے کر اعتراض کا پہلو نکالنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ اس شعر پر

شعلہ ہائے او صد ابراہیمؑ سوخت   تا چراغِ یک محمدؐ بر فروخت

جو اعتراض پیرزادہ صاحب نے کیا ہے کہ اُس کا انبیاء کی عظمت و شان پر اچھا اثر نہیں پڑتا ہم بھی اس سے متفق ہیں، لیکن ہمارا جہاں تک خیال ہے ڈاکٹر صاحب نے یہ مضمون اس کلام سے اخذ کیا ہوگا جو کسی بزرگ صوفی کا ہے:

صد ہزاراں سبزہ پوش از غم بسوخت   تا کہ آدمؑ را چراغے بر فروخت
صد ہزاراں جسم خالی شد ز روح   تا دریں حضرت در و گرگشت نوحؑ
صد ہزاراں پشہ در لشکر فتاد   تا ابراہیمؑ از میاں سر بر نہاد
صد ہزاراں خلق سر بریدہ گشت   تا کلیم اللہ صاحب دیدہ گشت
صد ہزاراں خلق در زنار شد   تا کہ عیسیٰؑ محرم اسرار شد
صد ہزاراں خلق در تاراج رفت   تا محمدؐ یک شبے معراج رفت

خودی کا عرفی مفہوم مراد لے کر پیرزادہ صاحب نے جو اعتراضات کیے ہیں ان تیروں کا نشانہ ڈاکٹر صاحب نہیں ہیں، کیونکہ انھوں نے اس کا مفہوم دوسرا قرار دیا ہے۔ ایسی صورت میں یہ بحث بالکل لفظی ہے۔

اصلیت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی حکیمانہ طبیعت نے جب مسلمانوں کے تنزل کے اسباب و علل دریافت کرنے کی طرف توجہ کی تو یہ سراغ پایا کہ امت اسلامیہ سے قوتِ عمل فنا ہوگئی اور جو عملی ولولہ اور جوش سلف میں تھا وہ خلف میں نہیں رہا۔ اور چونکہ ترقی کا مدار عمل پر ہے اس لیے پھر اُسی قوتِ عمل کو زندہ کر کے ہم ترقی کر سکتے ہیں۔ اس قوتِ عمل کے احیاء کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم کو اپنی ہستی کا بھی احساس ہو۔ اسی

نظریہ کی تعلیم کے لیے انھوں نے یہ مثنوی لکھی ہے۔ خودی کی تعریف میں کہتے ہیں:

پیکر ہستی ز آثارِ خودی ست   ہر چہ می بینی ز اسرار خودی ست
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد   آشکارا عالم پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او   غیر او پیدا ست از ثبات او
می شود از بہر اغراض عمل   عامل و معمول و اسباب و علل
زندگی محکم ز ایقاظِ خودی ست   کاہداز خواب خودی نیروے زیست

اس مفہوم کو مثنوی رموز بے خودی میں اور بھی صاف کر دیا ہے:

تو خودی از بیخودی نشناختی   خویش را اندر گماں انداختی
جوہر نوریست اندر خاک تو   یک شعاعش جلوہ ادراک تو
واحد است او بر نہ می تابد دوئی   من ز تاب او من استم، تو توئی
خویش دار و خویش باز و خویش ساز   نازہا می پرورد اندر نیاز
خوگر پیکار پیہم دیدمش   ہم خودی ہم زندگی نامیدمش

پیرزادہ صاحب فرماتے ہیں:

ہر چہ گفتی از خودی حاشا غلط   سر بسر از لفظ تا معنی غلط
در حیاتِ کس خودی را دخل نیست   خلق عالم نورسِ ایں نخل نیست
در حریم حق خودی را نیست بار   در حرم مزدور دیواں را چہ کار
از خودی بگذر کہ کار ایں ست و بس   خاصہ مسلم را شعار این است و بس

دراصل پیرزادہ صاحب خودی کے لفظ ہی سے بیزار کہتے ہیں:

اے خودی را مرکب خود ساختی   دبۂ در پائے پیل انداختی
اے خیال خامت اسرارِ خودی   پختہ کار رازِ پندارِ خودی
زہر را تریاق می گوئی بگوئے   بر ہلاک خویش می پوئی بپوئے
در عیارستانِ بازار صفا   سکۂ قال تو باشد ناروا

ہم کو حیرت ہے کہ ''عیارستان بازار صفا'' میں پیرزادہ صاحب منصور حلاج کی ''انا الحق'' کے تو نہایت سرگرم حامی ہیں اور ڈاکٹر اقبال کے ''انا الحق'' سے اس قدر بیزار!!

منصور کی حمایت میں فرماتے ہیں:

زاہداں منصور را خوں کردہ اند   بیکس و معذور را خوں کردہ اند

مرد حق گو را بدار آویختند   بے گنہ را خوں بنا حق ریختند
ہلہ اے زہاد آشفتہ دروں   ہلّہ اے استیزہ کارانِ جنوں
خونِ منصور از شما خواہم گرفت   خفتہ خوں را خونہا خواہم گرفت

ڈاکٹر صاحب نے حکیم افلاطون کی جو مذمت ''مسئلہ اعیان'' کی وجہ سے کی ہے۔ اس کے جواب میں پیرزادہ صاحب نے شیخ شہاب الدین کی کتاب تلویح سے ایک کشفی فضیلت نقل فرما کر اُس کی مدح سرائی فرمائی ہے۔ فلسفہ ٔ استدلال جاننے والوں کے لیے یہ جواب ایک لطیفہ ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ مذکور نے ارسطو کو دیکھا کہ وہ افلاطون کی مدح میں سرگرم ہے پوچھا کہ اس کے درجے کا کوئی اور حکیم نہیں؟ ارسطو نے سوائے بایزیدؒ کے اور کسی کو افلاطون کا ہم مرتبہ نہ بتایا۔ چنانچہ پیرزادہ صاحب اسی بنیاد پر اُس کی بابت کہتے ہیں:

جبرئیلے در لباس آدم است

ہم کو امید تھی کہ پیرزادہ صاحب حافظ کی مدافعت زیادہ جوش کے ساتھ کریں گے۔ لیکن یہاں مضمون بہت ہی مختصر نکلا کہتے ہیں:

اے کہ حافظ را شماتت میکنی   رند میکش را ملامت میکنی
اے بعلم خویش مخمور عمل   توچہ دانی سرِ مستانِ ازل

بحث تصوف

اصل مرکز بحث یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب یہ کہتے ہیں کہ مذہب اسلام ایک حقیقی پیغام عمل ہے۔ باوجود پیرو اسلام ہونے کے موجودہ مسلمانوں میں جو جمود ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ اُن پر ایک بیرونی عنصر مذہبی رنگ میں آ کر غالب ہو گیا ہے اور وہ تصوف ہے۔ اسی تصوف کے مسئلہ فنا اور نفس کشی نے مسلمانوں کی قوتِ عمل کو باطل کر دیا ہے۔ کیونکہ تصوف کا اثر تمام ادبیاتِ اسلامیہ میں ساری ہو گیا ہے اور ہر قوم کے ادبیات کا ایک تدریجی اثر اس قوم کے جذبات اور قوائے نفسانیہ پر ہوتا ہے، اس لیے رفتہ رفتہ اس کے اثر سے ہماری قوت عمل جاتی رہی۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں مسئلہ نفی خودی کو بنی نوع انسان کی مغلوب قوموں نے ایجاد کیا ہے کہ اس تعلیم سے مخفی طور پر غالب قوموں کو کمزور بنائیں۔

یونان میں فلسفہ ٔ اشراق اور ایران میں تصوف پھیلا اس وجہ سے ضمناً افلاطون اور حافظ کا بھی تذکرہ آیا۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال جیسا کہ پیرزادہ صاحب نے اپنی مثنوی کے بابت دیباچے میں خود انہیں کے الفاظ میں نقل کیا ہے۔ یہ ہے:

(۱) تصوف رہبانیت سے پیدا ہوا ہے۔
(۲) اسلام تصوف کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔
(۳) تصوف نے قرامطی تحریک سے فائدہ اٹھایا ہے۔
(۴) تصوف قیودِ شرعی کو فنا کر دینے کی کوشش کرتا ہے۔

اور اس کی بنیاد محض عقیدت پر نہیں بلکہ انھوں نے خود تحقیقات کی ہے:

(۱) میرے آباؤ اجداد کا مشرب تصوف تھا اور خود میرا میلان بھی تصوف کی طرف تھا۔
(۲) فلسفۂ یورپ کے پڑھنے سے اسلامی تصوف کی صداقت میرے دل میں مضبوط ہو گئی تھی۔ کیونکہ فلسفۂ یورپ بحیثیت مجموعی منجر بہ تصوف ہے۔
(۳) قرآن پر تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کو پڑھنے سے مجھے معلوم ہوا کہ میں غلطی پر تھا۔ تصوف اور فلسفۂ یورپ بھی غلط ثابت ہوا، اس واسطے میں نے تصوف کو ترک کر دیا۔

اس کے مقابلہ میں پیرزادہ صاحب فرماتے ہیں کہ ''میرا نسبی و نسبتی تعلق ایک قدیم صوفیانہ خاندان سے ہے، میرے آباؤ اجداد نے نسلاً بعد نسلٍ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے وقت سے جو میرے جدِّ اعلیٰ ہیں اس وقت تک تصوف کے دامانِ تربیت میں پرورش پائی ہے، میرا عقیدہ یہ ہے کہ ''اسلام عین تصوف ہے اور تصوف عین اسلام ہے''۔

مسئلہ عینیت

تصوف کا مسئلہ عینیت افلاطون کے مسئلہ اعیاں سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہے۔ ''ہمہ اوست'' کے عقیدے نے ایک ایسی ہمہ گیر عینیت کی بنیاد ڈالی کہ ہر ہر ذرہ عین آفتاب ہو گیا اور خالق اور مخلوق متحد ہو گئے۔

"انا الحق"

"سبحانی ما اعظم شانی"

''سبحان الذی خلق الاشیاء و ھو عینھا''

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ
خود بر سرِ بازار خریدار برآمد

خود انا الحق زد از لب منصور
خود برامد ز شوق برسرِ دار

گفت انا احمدؐ بلا میم
از زبان محمدؐ مختار

ندیم و مطرب و ساقی ہم اوست
خیال آب و گل در رہ بہانہ

یہاں تک کہ بعض یکہ تازان میدان تفرید کلمہ توحید کو بھی شرک خیال کرتے ہیں:

اے پسر لا الہ الا اللہ
خود ز شرک خفی است آئینہ دار
ہست شرک جلی رسول اللہؐ
خویشتن را ازیں دو شرک برار

ایک اور سرمست کا ترانہ سنیے:

من ہم زمینم ہم سما، من با تو ہستم جملہ جا
من مصطفیٰ را ہم خدا، من ملحد دیرینہ ام

فرعون اور موسیٰ علیہ السلام کے امتیازی حدود بھی مٹ گئے:

چونکہ بے رنگی اسیر رنگ شد
موسیٰ با موسیٰ در جنگ شد

تجرید کا یہ نعرہ مستانہ بھی سن لیجیے جس میں قافیے کی پابندی بھی ترک کر دی گئی ہے:

سر برہنہ نیستم دارم کلاہ چار ترک
ترک دنیا ترک عقبیٰ ترک مولیٰ ترک ترک

ان ''شطحیات'' کا ایک انبار ہے۔ ان میں بہت سی ایسی ہیں جن کو نقل کرتے ہوئے مجھ نا آشنائے سر وحدت کا قلم لرزتا ہے اور یہ ان حضرات کے اقوال ہیں جن کا ایک ایک لفظ ''عیارستان بازار صفا'' میں بے بہا جوہر سمجھا جاتا ہے، ایسی حالت میں اسلام کا عین تصوف اور تصوف کا عین اسلام ہونا کیا حیرت انگیز ہے۔

علم و عقیدت کی جنگ

تمام مصلحوں اور پیشواؤں کو سب سے پہلی خطرناک منزل جو پیش آتی ہے وہ یہی علم و عقیدت کی جنگ ہے۔ مصلح دیدہ تحقیق سے دیکھ کر ڈراتا ہے کہ اے قوم! جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے اسے پھینک دے

کیونکہ یہ زہریلا سانپ ہے مگر رسم پرست قوم کہتی ہے کہ نہیں، یہ تازیانہ ہے:

بوقت صبح شود ہمچو روز معلومت
که با که باخته ای عشق در شب دیجور

اس جنگ کے ہزارہا تماشے دنیا دیکھ چکی لیکن ابھی تک بدستور اس کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک شخص علمی تحقیقات سے مفید اور صحیح خیالات قوم کے سامنے پیش کرتا ہے۔ قوم اس کو جاہل، دشمن اسلام اور کافر بتاتی ہے۔ امام غزالی، ابن رشد اور امام ابن تیمیہ رحمہم اللہ صحیح راستہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن کسی کی کتابیں جلائی جاتی ہیں، کوئی جلاوطن کیا جاتا ہے۔ کسی کو قید خانے جانا پڑتا ہے۔ عقیدہ وہی صحیح ہے جس کی بنیاد علم یقینی پر ہو۔ محض رسمی عقیدہ ''عیارستان بازار تحقیق'' میں کوئی قیمت نہیں رکھتا۔

تصوف اور اسلام

سرچشمۂ اسلام یعنی قرآن وحدیث تصوف کے لفظ تک سے ناآشنا ہیں۔ یہ لفظ دوسری صدی ہجری میں عربی زبان میں داخل ہوا۔ مستشرقین یورپ و دیگر محققین سے کوئی کہتا ہے کہ تصوف فلسفۂ اشراق سے لیا گیا ہے۔ کوئی اس کا ماخذ کلیساؤں کی رہبانیت کو قرار دیتا ہے۔ ان کی تحقیقات لکھنے کا نہ یہ موقع ہے، نہ اس مختصر مضمون میں اس کی گنجائش ہے۔ تاریخ اسلام بھی ہمارے سامنے ہے۔ اس سے جہاں تک معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ ابتدا میں جو اہل زہد تارک الدنیا اور گوشہ گیر ہو کر عبادت اور ریاضت میں مصروف رہتے تھے ان کو لوگ صوفی کے نام سے پکارنے لگے۔ یعنی جیسا کہ پیرزادہ صاحب نے فرمایا:

پیش طاق صوفیاں احسان بود
اتباعِ سنت و قرآن بود

اس زمانے میں تصوف اخلاص کا نام ہے جس کو حدیث شریف میں ''احسان'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہی وہ تصوف ہے جس کی مدح غزالی وغیرہ ائمہ اسلام نے لکھی ہے۔

لیکن جب تاتاریوں کے حملے شروع ہوئے اور چنگیز اور ہلاکو نے ایک قیامت صغریٰ برپا کر دی تو ان کی ہولناک خون ریزیوں سے امت کے فاتحانہ جذبات مٹ گئے۔ دنیا کی طرف سے ان کے دل سرد ہو گئے۔ طبیعتوں کا جوش اور ولولہ جاتا رہا۔ حوصلے پست اور ہمتیں سست ہو گئیں۔ زوال وفنا کے نقشے آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ میلان خاطر زہد اور ترک دنیا کی طرف بڑھ گیا اور سرمایۂ توکل وقناعت کو لے کر گوشۂ عافیت پر بیٹھنا پسند آیا۔ عالمِ فانی کے جاہ وجلال کی وقعت نگاہوں میں نہ رہی۔ بوریاے فقر سریر سلطنت سے زیادہ عزیز سمجھا گیا۔ کلاہِ نمدی کو تاجِ زر پر ترجیح دی گئی اور پکار اُٹھے:

گوشۂ عافیت و کنج قناعت گنجیست
کہ بشمشیر میسر نہ شود سلطان را

بفراغِ دل زمانے، نظرے بہ ماھروے
بہ ازانکہ چترِ شاہی عمر و ھائے و ھوئے

مئے دو سالہ و معشوق چار دہ سالہ
ہمیں بس ست مرا صحبت صغیر و کبیر

شکوہِ تاج سلطانی کہ بیم جان در و در جست
کلاہِ دلکش است اما تبرک سر نمی ارزد

ذوق عمل طبائع سے یہاں تک مسلوب ہو گیا کہ ''شیوہ قلندری'' کے مقابلے میں ''رہ و رسمِ پارسائی دور دراز'' نظر آنے لگی۔ عالم ذوق میں، حلقۂ یاراں میں ''خلوت در انجمن'' ہونے لگی اور سجادے ہی پر ''سفر در وطن'' کی کڑی منزلیں طے کی جانے لگیں۔ شریعت اور حقیقت دو جداگانہ راستے قرار پائے اور ان میں پوست اور مغز کی تفریق کی گئی۔ علما و فقہا محجوب و بے بصر سمجھے گئے۔ یہ اثرات اگر صرف ایک ہی جماعت تک محدود ہوتے تو نقصان نہ ہوتا۔ لیکن شاعری کے ساز پہ یہ ترانہ کچھ اس انداز سے چھیڑا گیا کہ تمام ملک اس صدا سے گونج اٹھا اور ادبیات اسلامیہ میں ایک قسم کے جمود اور رہبانیت کا اثر ساری ہو گیا۔

زوال شوکت اسلام

شوکت اسلام کے زوال کے اسباب یوں تو پہلی ہی صدی ہجری سے شروع ہو گئے تھے، مثلاً سیاست کی خرابی، یعنی وہ جمہوریت جو اسلام لے کر آیا تھا، جس نے ہر مسلمان کو آزاد اور خودمختار بنا دیا تھا، ہاتھوں سے جاتی رہی اور اس کے بجائے استبدادی حکومت قائم ہو گئی، جس نے تمام امت کو غلام بنا دیا۔ مسلمان بے گناہ قتل کر دیے جاتے تھے۔ ائمہ و علماء جو اپنے اپنے زمانے کے روشن چراغ تھے.... بیشتر زیر عتاب، زیر خنجر یا زیر طوق و زنجیر رکھے جاتے تھے اور حق گو زبانیں اس قدر خاموش کر دی گئی تھیں کہ ان مظالم کے خلاف ایک لفظ نہیں نکال سکتی تھیں۔ اس طرح ہر ''مسلم'' حریت عمل سے محروم کر دیا گیا، پھر علمی تقلید جس سے حریت فکر بھی جاتی رہی۔ یہ شکنجہ ایسا سخت تھا کہ ایک زمانے میں یہاں تک نوبت پہنچ گئی تھی کہ اہل علم اس خوف سے کہیں کوئی دشمن ان کے اوپر تہمت لگا کر قتل نہ کرا دے، اپنی صحت عقیدہ کی سند قاضی سے لے کر ہر وقت اپنے پاس رکھتے تھے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اسلام میں اس بیرونی عنصر کے شمول سے جو

جمود پیدا ہوا اس نے بھی بہت کچھ ان اسباب زوال کو تقویت دی اور خاص کر ہندوستان میں تو اسلام کی حالت اور بھی خراب ہوئی۔ یہاں تک کہ ایک غیر مسلم شخص یعنی قومیت کا مشہور مبصر ڈاکٹر لیبان اپنی کتاب تمدن ہند میں یہاں کے مسلمانوں کی نسبت یہ لکھنے پر مجبور ہوا کہ:

وہ اسلام جو اس وقت ہند میں رائج ہے اس کی حالت بھی ویسی ہی ہوگئی ہے جیسے ہند کے اور مذاہب کی۔ اس میں مساوات بھی قائم نہیں جس کی وجہ سے اوائل میں اس کو اس قدر کامیابی ہوئی تھی۔

پھر ایک اور جگہ لکھتا ہے:

ہندوستان کے اسلام کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ اس مذہب کی یہاں آ کر کیسی مٹی خراب ہوئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے رموز بے خودی میں موجودہ مسلمانوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں کچھ بھی شاعرانہ مبالغہ نہ سمجھا چاہیے:

مسلم از سر نبی بے گانہ شد
باز ایں بیت الحرم بت خانہ شد
از منات و لات و عزیٰ و ہبل
ہر یکے دارد بتے اندر بغل
شیخ ما از برہمن کافر تر است
زانکہ او را سومنات اندر سر است
رخت ہستی از عرب بر چیدہ ای
در خمستانِ عجم خوابیدہ ای
مثل ز برفاب عجم اعضائے او
سرد تر از اشک او صہبائے او
ھمچو کافر از اجل ترسندہ اے
سینہ او فارغ ز قلب زندہ اے

قرآن شریف میں نصِ قطعی موجود ہے۔ ''ولن یجعل اللّٰہ للکافرین علی المومنین سبیلا'' پھر آخر کیا وجہ ہے کہ ہم اس سے محروم ہو گئے؟ میرے خیال میں اس کا جواب صرف یہی ہے جو قرآن شریف دیتا ہے ''ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا''۔

ڈاکٹر صاحب نے بہت صحیح فرمایا ہے:

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

صوفی پشمینہ پوش حال مست
از شراب نغمۂ قوال مست

آتش از شعر عراقی در دلش
ورنہ می سازد بقرآن محفلش